



تخفہ Qaafqalam.com

طاہر جاوید منسل

اخلاقی بربادی جب عروج پر پہنچ جائے تو معاشرتی تباہی کوئی حیران کن بات نہیں رہتی... خواہش جب ضرورتوں سے آگے نکل جائے... کسی کا ایثار کسی کی خود غرضی میں ڈھل جائے... جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو ایسے میں قدرت کیوں نہ انتقام لے... ان دنوں وہ بھی ایسے ہی عذاب میں گرفتار تھا۔ اسے بہ ظاہر تمام دنیاوی خوشیاں میسر تھیں مگر پھر بھی... تہی داماں تھا۔

مخالف سمت میں ٹھو پرواز سوچوں کا عبرتناک انجام

میں فہد احمد، عمر چالیس سال۔ زندگی میں وہ سب حاصل ہے جس کی خواہش ایک عام انسان کر سکتا ہے۔ ایک پیاری، نیک اور سلیقہ شعار بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ اچھی رہائش اور باعزت روزگار لیکن ان سب چیزوں کا اصل لطف اور حقیقی خوشی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ کئی برس پہلے پیش آنے والا وہ واقعہ ہے جس کی شدید کڑواہٹ میں آج بھی اپنے رگ و پے میں محسوس کرتا ہوں۔ میں نے سمن آباد لاہور میں رہائش پذیر ایک متوسط

گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں اور سب سے بڑے سکندر بھائی مجھ سے سات سال بڑے تھے۔ میں چھ سال کا تھا کہ اس فیکٹری میں آگ لگ گئی جہاں ابا جان کام کرتے تھے۔ اس حادثے میں کئی دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شدید زخمی ہوئے اور دو دن اسپتال میں رہ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ایک غم اور مصیبت کا پہاڑ تھا جو امی جان پر ٹوٹا، لیکن ہم بچوں کی خاطر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہستی کو سمیٹا اور زندگی کا پہیا پھر سے چلنے لگا۔ امی جان نے سلائی کر کے اور گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر روزمرہ کے اخراجات اور ہماری فیسیں پوری کیں۔ صبح پانچ بجے سے رات بارہ بجے تک ہم انہیں سرگرم عمل دیکھتے رہتے، اس سرگرمی میں گھر کے کام کاج شامل تھے اور ذریعہ معاش بھی۔ امی جان کی خواہش تھی کہ سکندر بھائی جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی میدان میں آجائیں۔ اسی دوران میں بڑی آپی کی شادی ہو گئی اور وہ دینی چلی گئیں۔ سکندر بھائی نے ایم بی اے مکمل کیا اور انہیں ان کی یونیورسٹی میں ہی مناسب جاب مل گئی۔ میں اس وقت آنٹی کام کے پہلے سال میں تھا۔ بھائی کی جاب کے بعد امی نے سلائی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ بس شام کے وقت امی اور میں گھر میں ٹیوشن پڑھالیا کرتے تھے۔ اس دوران میں چھوٹی آپی کا ایک اچھا رشتہ آیا اور ان کی بھی شادی ہو گئی۔

سکندر بھائی مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میری چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور فرمائشوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے جبکہ اس کے لیے کبھی انہیں امی سے ڈانٹ بھی کھانی پڑتی، ایک دن میں نے کہا۔

”بھائی جان، آپ کو یاد ہے، آپ نے کہا تھا کہ جب اگلی ”پے“ ملے گی تو آپ مجھے ”زنگر“ کھلائیں گے؟“
 ”زنگر؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ بھائی نے ازراہ مذاق کہا۔
 ”بھائی جان، دیکھیں آپ مکر رہے ہیں اب۔“
 ”اچھا بابا! کل آؤں گا تو پھر چلیں گے۔“

”فہد! اپنے بھائی کے فضول کے خرچے کروانا بند کر دو۔“ امی جان نے غصے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں امی جان! اس کے خرچے نہیں کروں گا تو پھر کس کے کروں گا۔“

”سکندر! میں سوچتی ہوں دوڑھائی سال تک تمہاری شادی کر دوں۔ اس کے لیے کچھ پیسے جوڑنا شروع کروں۔“

آمنہ نے بھی اب بی اے میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔
 آمنہ ہماری اکلوتی پھپھو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ امی نے

بچپن میں ہی اسے بھائی کے لیے مانگ لیا تھا۔ ہم بات معلوم تھی۔ ایک دوسرے کے گھر کافی آنا جانا بھی سکندر بھائی بولے۔ ”امی جان! ابھی نہیں جانتی ہیں کہ میری آدمی سے زیادہ تنخواہ فہد کی فیسو پر خرچ ہو جاتی ہے۔ میں اس کو بہتر سے بہتر تعلیم دوں ہوں اور کسی اچھے مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

سکندر بھائی جہاں میری خواہشات کا خیا تھے وہاں انہیں میری تعلیم اور تربیت کی بھی بے حد تھی۔ آفس سے گھر آ کر رات سات بجے سے نو بجے مجھے پڑھاتے۔ جن مضامین میں، میں کمزور تھا ان کو توجہ دیتے اور اکثر مہنگی ٹیوشن بھی رکھ دیتے۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ میں نے آنٹی کام اچھے میں پاس کیا اور مجھے ایک اچھی یونیورسٹی میں ”بی“ میں ایڈمیشن مل گیا۔ چونکہ سکندر بھائی کا تعلیمی مر بزنس اسٹڈی ہی تھا، اس لیے مجھے ان سے پڑھ بھر پور مدد ملتی رہتی تھی اور تین سال یونہی گزر گئے۔ ہوا کہ پھپھو کا انتقال ہو گیا۔ امی نے آمنہ کے سر پر اور اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ گھر میں ایک اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ گھر کے خرچ کو احسن طریقے کرنے کے لیے بھائی نے آفس سے آ کر ایک جائے ٹائم جاب شروع کر دی۔ اب بھائی کو میرے پاتیں کرنے اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے ہی ملتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بے پروا ہو۔ بس ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ یونیورسٹی سے جب میں اپنے گھر کی گلی مڑتا تو گلی کے شروع میں ایک ٹولا کھڑا خوش گپیوں میں مصروف ہوتا، تقریر کے پاس موٹر یا ٹیکسی تھیں۔ ان میں سے ایک میرے اور دو مجھ سے ذرا بڑے معلوم ہوتے تھے۔ میں سر کاٹش ان کی طرح کبھی میرے پاس بھی بایک ہو۔ ایک دن ان کے پاس سے گزرا تو ان میں بایک کو گھما کر اس کے کرتب دکھا رہا تھا، میں ان کھڑا ہو گیا۔ اسی دوران میں میری ان سے سلام جو میرا ہم عمر تھا اس کا نام جہانزیب تھا۔ باقی دو ایک کا نام عامر اور ایک کا لیاقت تھا۔ میں ان کے آدھ گھنٹا کھڑا رہا۔ اس دوران میں ایک دوسرے تعارف ہوا اور ہم خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ پھر یہ بات روٹین میں آ گئی۔ روز یونہی

آثار قدیمہ

ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔ ”مجھے ایسی جگہ ملازمت مل گئی ہے، جہاں آثار قدیمہ کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔“

”اچھا وہ کون سی جگہ ہے۔“ دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔

”مجھے ایک بیوٹی کلینک میں کام مل گیا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

مہارت

لڑکی کے باپ نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”نکل جاؤ میرے گھر سے، مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم گورکن ہو، حالانکہ تم کہتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔“

”جناب میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا۔“ نوجوان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں کہ میری روزی رونی کا دارو مدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔“

مرسلہ: شبانہ، لاہور کینٹ

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ تینوں دوست متوسط گھرانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی فراخ دلی سے پیسے خرچ کس طرح کرتے ہیں اور ان کے پاس نت نئی چیزیں کہاں سے آتی ہیں۔ یہ بڑا حیران کن بلکہ کسی حد تک پریشان کن انکشاف تھا۔ ایک دن جہانزیب کوئی خاص قسم کا سگریٹ پی رہا تھا اور عجیب سی ترنگ میں تھا۔ اس نے مجھ سے کھل کر باتیں کیں اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہ سارے دوست غیر قانونی حرکتوں میں ملوث ہیں۔ ان سب کی اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے تھے، سمن آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں راہزنی کرتے تھے۔ خاص طور سے پوش علاقوں کی اندرونی سڑکوں پر راہ چلتے لوگوں سے ان کی قیمتی اشیاء گن پوائنٹ پر چھین لیتے تھے۔

میں ان انکشافات پر حیران ہو رہا تھا اور کسی حد تک اپنے اندر خوف بھی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے سکندر بھائی کی تنبیہ بھی یاد آئی تھی..... اور اپنے ان دوستوں پر غصہ بھی آرہا تھا۔

ایک دن میں نے ان سے بات کی۔ ”یار! جو باتیں جہانزیب نے مجھے بتائی ہیں وہ بڑی خطرناک ہیں، تم لوگوں

پر میں کچھ دیر کے لیے ان کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ ان کا موضوع، نئی کاریں، نئی فلمیں، نت نئے ریسٹوران۔ ایک دو بار نئے ماڈلز کے پہلے وغیرہ پر بھی بات انہوں نے مجھے یہی بتایا کہ وہ کالج کے دوست ہیں۔ انہوں نے واپسی پر ان کے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا گزارنا چاہا مگر وہ لیکن ایک بات میں نے نوٹ کی کہ جب میں ان کے پاس آتا، وہ کسی موضوع پر بات کرتے تھے خاموش ہو جاتے اور پھر موضوع بدل دیتے۔

ایک دن میں گھر واپس آیا تو بھائی جان گھر پر ہی تھے۔ ”ملیم السلام۔ کیا حال ہے؟“

”ٹھیک، آپ کیسے ہیں؟“ بھائی مجھ سے کچھ خفا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ ذرا ڈرائنگ روم میں آنا۔“

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ”آپ کے لیے چائے لے آؤں؟“ آمنہ بھائی نے بھائی کو آواز دی۔

”ہاں دو کپ ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔“ بھائی نے اس سے کہا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ بھائی بولے۔ ”فہد! اب ہم کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ تم گلی کے شروع میں کچھ کے پاس بیٹھ کر ساتھ کھڑے ہوتے ہو۔“

”جی بھائی! بس ان سے بول چال ہے میری۔ کیا میں اندازہ نہیں میں کچھ غلط ہے بھائی؟“

”غلط ہے۔ تمہیں اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دینی چاہیے۔“

”لیکن بھائی! ہم تو بس ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔“

”آئی دوران میں آمنہ چائے لے آئی۔ آمنہ کے بعد بھائی بولے۔ ”دیکھو جن لوگوں کو ہم اچھی طرح جانتے نہ ہوں ان سے ایسا رابطہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ ان لوگوں سے تمہارا میل جول مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔“

میں نے بھائی کی اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا اور اپنی دوستی برقرار رکھی۔ کبھی کبھی ہم چاروں مل کر ایک قریبی

میل میں رات کا کھانا کھانے چلے جاتے۔ میرے کھانے کے پیچھے بھی زبردستی جہانزیب وغیرہ ہی دیتے۔ مجھے ان کے ساتھ

ایک پرگھونٹے پھر نے میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔

☆☆☆

کو اندازہ ہے کہ کس قدر غلط کاموں میں پڑے ہوئے ہو؟
میں بڑا مایوس ہوا ہوں تم سے۔“

عامر نے کہا۔ ”یار مایوس کن ہماری حالت نہیں ہے۔
پیارے! اگر تم اپنی طرف دیکھو تو اپنی حالت تمہیں مایوس
کن لگے گی۔“

”عامر صحیح کہہ رہا ہے۔“ لیاقت نے سگریٹ کا کش
لیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، تمہارا بڑا بھائی بہت اچھا اور نیک
انسان ہے۔ اس کا ایک صاف ستھرا روزگار ہے اور وہ پوری
ایمانداری سے محنت کر کے کما رہا ہے۔ ہم مانتے ہیں.....
بالکل مانتے ہیں، لیکن دیکھو، اس کے باوجود تم لوگ بس گزر
بسر ہی کرتے ہو۔ جو چیزیں ہمارے پاس ہیں وہ تمہارے
بھائی کو بھی میسر نہیں ہیں، تو وہ تمہیں کیا دے گا۔ ہم بھی
تمہارے جیسے ہی ہیں لیکن اپنے اندر حسرتیں وغیرہ لے کر
نہیں پھر رہے۔ وہ سب کچھ ہمیں ملتا ہے جس کی ہمیں خواہش
ہوتی ہے..... سب کچھ۔“ اس نے ایک آنکھ میچی۔

جہانزیب بولا۔ ”دیکھو جگر! ایسا نہیں ہے کہ ہم تم پر
ظن کر رہے ہیں۔ تم یار ہو..... تمہارے لیے دل سے محسوس
کرتے ہیں۔ اب دیکھو نوکیا کا جو نیا موبائل آیا ہے..... تم
کتنے کریزی ہو اس کے لیے۔ تم روز بات کرتے ہو اس
کی۔ تمہاری یونیورسٹی میں کئی لڑکے لڑکیوں کے پاس وہ
ہوگا۔ لیکن تم اس کے بارے میں بس سوچ سکتے ہو، خرید نہیں
سکتے۔ وہ تم سے اتنی ہی دور ہے جتنی انجلینا جولی..... تم نے
موبائل کے بارے میں اپنے بھائی سے کہا..... تو انہوں نے
کیا کہا؟ یہی کہا نا کہ دو چار مہینے صبر کر لو۔ ہو سکتا ہے کہ
جولائی میں میری ”پے“ بڑھ جائے تو تمہیں لے دوں۔
جب تک وہ تمہیں لے کے دینے کے قابل ہوں گے تب
تک وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہوگا۔ پنجابی فلموں کی
ہیروئن صائمہ آنٹی کی طرح۔“

سب نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔

پتا نہیں کیوں، جہانزیب کی بات میرے دل پر ایک
اثر چھوڑ گئی۔ چاہتے ہوئے بھی میں اس کو جھٹلا نہیں سکا۔

گھر پہنچا تو آمنہ اور امی رات کا کھانا بنانے میں
مصروف تھیں۔ میں تپا ہوا تھا۔ میں نے کچن کے دروازے
پر کھڑے ہو کر کہا۔ ”امی جان! میں ایک مہینے سے کہہ رہا
ہوں۔ مجھے نیا موبائل چاہیے۔ مجھے خریدنا ہے وہ۔ ہر
صورت میں خریدنا ہے۔“

”جب کمانے لگو گے نا، تب ایسی چیزیں لے لیا
کرنا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ گزارا کیسے ہو رہا ہے۔ اس کے

باوجود تم اس طرح کی فرمائشیں کر رہے ہو۔ میں کچھ عرصے
سے دیکھ رہی ہوں فہد! تم بے حس ہوتے جا رہے ہو۔“
”اچھا! اگر میں کوئی چیز خریدنا چاہوں گا تو وہ بے حس
ہوگی اور بھائی جان نے جو تین دن پہلے اٹھائیس ہزار
بانیک خریدی ہے وہ؟“

”فہد! تمیز سے بات کرو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں امی
بات کرتے ہوئے..... پانچ سال ہو گئے اسے بسوں
دھکے کھاتے ہوئے اور اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس
ضرورت ہے سواری۔“ امی جان واقعی غصے میں تھیں۔
”امی جان! میرا یہ مطلب نہیں۔“

اچانک ڈور تیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سہ
بھائی تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہماری آوازیں ذرا بلند
اور بھائی نے سب سن لیا ہے۔ بہر حال انہوں نے کوئی
نہیں کی۔ بعد میں میں نے امی اور آمنہ کو خاص طور پر کہا
التجا کی کہ وہ بھائی سے یہ بات نہ کہیں۔

رات کے کھانے کے بعد امی اور آمنہ خرید
کرنے سپراسٹور گئیں تو بھائی نے مجھے بلا کر ایک مرتبہ
سمجھانا شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ پہلے انہوں نے
میری کسی دوستی اور میل جول پر اعتراض نہیں کیا لیکن
لڑکوں کی صحبت انہیں میرے لیے بھلی محسوس نہیں ہے
انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا کہ میں ان لڑکوں کے
گھومنے پھرنے ہرگز نہ جاؤں۔

رات کو سونے کے لیے لیٹا تو مجھے لگا کہ بھائی
گھومنا پھرنا اور کسی طرح کی تفریح کرنا اچھا نہیں لگتا۔
دل چاہتا ہے کہ میں بس گھر میں بیٹھ کر اپنی محرومی
”انجوائے“ کروں۔

اگلے دن جب میں اپنے خوش باش اور زندگی
بھر پور دوستوں کی کمپنی میں پہنچا اور ان سے گپ شپ
کی تو مجھے لگا کہ ان سے بڑا احسن اور ہمدرد، میرا کوئی نہیں
”یار! تم لوگ واقعی ٹھیک کہتے ہو۔ میرے
میں کبھی کبھی انسان کو اپنی خوشیوں کے لیے لڑنا پڑتا
قدرت سے اپنے حصے کی خوشیاں چھیننا پڑتی
جہانزیب کے ہاتھ سے سلگتا ہوا سگریٹ لے کر میں۔
کا بھرپور کش لگاتے ہوئے کہا۔

”آخہ..... یہ ہوئی نا بات۔ میں سمجھ گیا تو
چاہتا ہے جگر۔“ لیاقت نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
”ہاں یار! میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اس ماہ
کے دور میں خود کو خوش رکھنے کے لیے تم لوگ جو کچھ

ہو وہ اتنا غلط بھی نہیں۔“ میں نے پُرسوج نگاہوں سے کہیں دور دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، کل چل ہمارے ساتھ۔ کل کچھ کمانے کا ارادہ ہے۔“ جہانزیب نے دوسرے ساتھیوں کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں یار! تمہارے ساتھ چلنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ بڑا جگرے کا کام ہے۔“

”جانے دو پیارے! ہم تمہیں کون سا ہسٹل پکڑا رہے ہیں کہ ابھی چلو ہمارے ساتھ اور پھر کا دو کسی کو۔ بس ساتھ چلو ذرا اور دیکھو کہ ”کام“ کیسے ہوتا ہے۔“ عامر نے کہا۔

”اور ہاں، دل میں ترس لانے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں جن کا تھوڑا بہت چلا بھی جائے تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ لیاقت بولا۔

”کافی دیر تک ان کے ساتھ بات ہوتی رہی۔ نتیجتاً میں نے اپنے اندر کی آواز کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیا۔ شاید میں ان کے گروہ کا حصہ بننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔“

☆☆☆

اگلے ایک ماہ میں، میں نے اپنے ان دوستوں کے ساتھ تین جگہ ”کام“ کیا، یعنی واردات میں حصہ لیا۔ اگرچہ میں نے صرف بائیک دوڑانے پر اکتفا کیا لیکن مجھے کافی حد تک مشاہدے اور تجربے کا موقع ملا۔ گلیگ کے علاقے میں ہم نے دو دفعہ کارروائی ڈالی۔ پہلی دفعہ ایک درمیانی عمر کے آدمی سے موبائل اور نقدی چھینی جو غالباً آفس جانے کے لیے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ دوسری مرتبہ ایک عورت کا پرس چھین کر بھاگے جو شاید کسی مہنگے شاپنگ سینٹر سے خریداری کرنے جا رہی تھی۔ اس پرس میں سے اچھی خاصی رقم ملی۔ ٹی وی ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے والی ایک جونیئر آرٹسٹ سے جہانزیب کی دوستی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم اس آرٹسٹ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے پر خرچ کی۔ اس کے بعد ہم نے نیو مسلم ٹاؤن کے علاقے میں ایک ادھیڑ عمر بندے سے کافی مہنگا موبائل گن پوائنٹ پر چھینا جو صبح سویرے ہسنان سڑک پر جا گنگ کر رہا تھا۔

”یار، کبھی کسی پر سچ مچ فائر تو نہیں کیا؟“ ایک دن میں نے جہانزیب سے پوچھا ہم قریبی ریسٹورنٹ میں شام کی چائے پی رہے تھے۔

”نہیں پیارے۔“ لیاقت نے کہا۔ ”اب تک کی

ہسٹری میں بس دو دفعہ گڑبڑ ہوئی ہے۔ لیکن وہ بھی تب ہوئی جب دوسری طرف سے کچھ زیادہ ہی ہیر و پن دکھایا گیا۔ پھر بھی سیدھا فائر نہیں مارا کسی کو۔ ٹانگ یا بازو پر گھوڑا دیا ہے۔“ لیکن گھوڑا تو دیا یا نا؟“ میں نے کہا۔

عامر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اوائے باگڑیلے... تو نے وہ شعر نہیں سنا۔ کبھی گولی بھی چلتی ہے کالی کالی شاموں میں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

دو دن بعد میری سالگرہ تھی۔ جہانزیب وغیرہ نے کہا کہ اس دن چائیز ریسٹوران میں ڈنر کریں گے، لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ سالگرہ والے دن امی جان رات کے کھانے کا خاص اہتمام کرتی تھیں اور سب اکٹھے ہی کھانا کھاتے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ چلا جاتا تو گھر میں سب کو برا لگتا اور وہ میرے حوالے سے مزید شک میں مبتلا ہو جاتے۔

سالگرہ والے دن صبح سویرے یونیورسٹی جانے کے لیے اٹھا تو امی اور آمنہ نے مجھے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ امی نے رات کے کھانے میں میری فرمائش پوچھی۔ میں نے چکن بریانی بنانے کو کہا۔ آمنہ وہی بھلے اچھے بناتی تھی۔ میں نے اس سے وہی بھلوں کی فرمائش کی اور یونیورسٹی چلا گیا۔ رات کے کھانے کے لیے تو میں نے دوستوں کو منع کر دیا تھا لیکن انہوں نے مجھے شام کی چائے کے لیے قریبی ریسٹوران میں مدعو کیا تھا۔ یونیورسٹی سے واپسی میں میں روڈ کی دوسری طرف واقع ریسٹوران میں پہنچا جہاں پر وہ سب میرے منتظر تھے۔ سب نے مجھے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ انہوں نے چائے اور کیک کا آرڈر دے رکھا تھا۔ میں نے کیک کاٹا اور پھر ہم چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

”یہ لے جگر! ہم سب کی طرف سے تیری سالگرہ کا گفٹ۔“ جہانزیب نے نوکیلا کا ڈبا پیک موبائل میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ یہ وہی موبائل تھا جس کے لیے میں آج کل دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ میری خوشی دیدنی تھی۔

”یہ کہاں سے ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”خون پسینے کی کمائی ہے پیارے۔“ جہانزیب نے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

میرے اصرار پر لیاقت نے بتایا کہ آج دوپہر ربوہ

نے مون مارکیٹ کے علاقے میں ”کارروائی ڈالی“ تھی۔

ریبوہ بھی ان لوگوں کا دوست تھا، لیکن میں اس سے کبھی

ملا نہیں تھا۔ بس ایک دو بار موبائل میں اس کی تصویر دیکھی

تھی۔ اس کا اصل نام خورشید تھا لیکن ریبوہ کہتے تھے۔

جہانزیب نے اس کارروائی کی تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ آخر میں بولا۔ ”دیکھو کیسی گڈ لک ہے۔ آج تمہاری سالگرہ ہے اور آج ہی ریمبو کو یہ موبائل ہاتھ لگ گیا۔ اس کو کہنے لگا کہ اوپر والا جب دیتا ہے تو چھپر بھاڑ کر دیتا ہے۔“ مجھے پتا تھا کہ ریمبو کے ساتھ ان لوگوں کا لین دین چلا رہا ہے۔ اسی لین دین میں انہوں نے ریمبو سے یہ بیٹ لے کر مجھے گفٹ کر دیا تھا۔ اس کی قیمت سولہ ہزار سے کم نہیں تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بہر حال کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے اپنا یہ محبوب موبائل بیٹ قبول کر لیا۔ ہم چاروں کچھ دیر تک اس شاندار بیٹ کے فنکشنز وغیرہ ڈسکس کرتے رہے۔ پھر یہ تقریب اختتام کو پہنچی اور میں گھر روانہ ہو گیا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ امی اور بھائی جان کو بعد میں مکی پتاؤں کا کہ میں نے پاکٹ منی جمع کر کے اور ایک جگہ ہوم ٹیوشن پڑھا کے چپکے چپکے کچھ پیسے جمع کیے تھے اور یہ موبائل خریدا ہے۔

گھر پہنچا تو امی اور بھائی بچن میں مصروف تھیں۔ میں شاور لینے کے لیے اپنے کپڑے پکڑ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ امی جان نے فون ریسو کیا۔ ایک دلخراش چیخ تھی جو امی جان کے گلے سے نکلے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو امی بے ہوش ہو کر فرش پر گر چکی تھیں۔ آمنہ بھی بچن سے دوڑتی ہوئی آئی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

”میں انسپکٹر ریاض بات کر رہا ہوں۔ سکندر آصف سے کیا رشتہ ہے آپ کا؟“

”جی..... جی..... میں بھائی ہوں ان کا۔“ مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”ہم کافی دیر سے آپ کا اتنا پتا ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے بے حد افسوس ہے۔ آج ڈھائی تین بجے مون مارکیٹ میں ایک موبائل شاپ کے سامنے سکندر کو کوئی ماری گئی ہے۔“

میں سر تاپا کانپ رہا تھا۔ ”اب کہاں ہیں بھائی جان۔؟“ میں ہکلا یا۔

”ڈاکٹر اس کو نہیں بچا پائے..... آپ فوراً سروسز اسپتال پہنچیں۔“ میں بس اتنا ہی سن سکا اور میرے ہاتھ سے لہو بہہ پھوٹ گیا۔

آمنہ درہی تھی اور امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ سکندر کو کیا ہوا ہے۔

میں اور میرے دو کزن بھگم بھاگ پہلے متعلقہ تھانہ اور پھر سروسز اسپتال پہنچے۔ میرا بھائی ختم ہو چکا تھا۔ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔ متعلقہ پولیس بھی وہاں موجود تھی۔ میں رو رہا تھا۔ بچکیاں رکنے میں نہیں آرہی تھیں۔ ایک سب انسپکٹر نے تسلی دینے والے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے بھائی جان کی کچھ ذاتی اشیا دکھائیں۔ یہ ان کی جیبوں سے نکلی تھیں۔ پرس، قلم، کچھ ریزگاری۔ چند رسیدیں بھی تھیں۔ سب انسپکٹر نے دو رسیدیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان سے ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ وارداتی نے موبائل اور نقدی چھیننے کے دوران میں ان پر گولی چلائی۔“

میں نے ایک رسید پر نگاہ ڈالی اور مجھے گرد و پیش گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ اس موبائل کی رسید تھی جو آج چند گھنٹے پہلے لیاقت اور جہانزیب وغیرہ نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ دوسری رسید دراصل ایک ڈیلوری لیٹر تھا۔ اس لیٹر سے پتا چلتا تھا کہ بھائی جان نے آج ہی اپنی موٹر بائیک بھی نیچی ہے۔ انہوں نے بائیک بیچ کر میرے لیے موبائل خریدا تھا، جو ان سے مون مارکیٹ کے سامنے چھین لیا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھانے لگا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اس اندوہناک واقعے کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتا وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیاقت اور جہانزیب وغیرہ روپوش ہو گئے..... پکڑے نہیں گئے لیکن قریباً ایک سال بعد وہ دونوں آپس کی کسی گروہی لڑائی میں مارے گئے۔ عامر اور اصل مجرم خورشید عرف ریمبو کا کبھی کوئی پتا نہیں چلا۔ غالباً وہ پاکستان سے نکل گئے تھے۔ امی جان کو دل کی تکلیف ہو گئی اور کچھ عرصہ بستر علالت پر رہ کر وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔ امی جان کی وصیت کے مطابق میں نے شادی کر لی۔ جی ہاں آمنہ ہی میری شریک حیات ہے۔

بھائی کے آفس والوں نے ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے بھائی کی جگہ مجھے جاب کی آفر کی جو میں نے قبول کر لی..... میں فہد احمد، عمر چالیس سال۔ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ایک عام انسان خواہش کر سکتا ہے، لیکن میرے احساسِ جرم نے مجھے ان سب چیزوں کی حقیقی لذت سے محروم رکھا ہے۔ کاش میں کبھی آمنہ کو بتا سکوں کہ میں ان لیٹروں کا ساتھی رہا ہوں جنہوں نے بھائی سے ان کی زندگی چھینی۔

جہانزیب